33

اپنی زندگیوں کو زندہ بناؤ

(فرمودہ ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء)

تشہد و تعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے فرمایا۔

بسبب نزلہ اور کھانسی چونکہ حلق میں تکلیف ہے۔ اس لئے آج میں کچھ زیادہ بات کرنا نہیں چاہتا۔ مگر مختصر الفاظ میں ایک امر کی طرف اپنے دوستوں کو توجہ دلاتا ہوں میں نے اس کے متعلق پہلے بھی بتایا ہے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اب تک لوگوں میں ایسی روح نہیں دیکھتا جس سے معلوم ہو سکے کہ انہوں نے اس بات کو سمجھ لیا ہے۔ اور اگر سمجھ لیا ہے تو عمل کرنے کی طرف توجہ کی ہے۔

وہ بات یہ ہے کہ صرف کسی طریق کو اختیار کر لینا کسی مقصد کا پا لینا نہیں ہوتا۔ کسی طریق کے اختیار کرنے کے صرف یہ معنی ہوا کرتے ہیں کہ ایک صداقت کا انسان اقرار کر لے۔ مگر صرف صداقت کا اقرار کافی نہیں ہوتا۔ صداقتیں دنیا میں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن صرف ان کے اقرار سے کسی کو کوئی نفع نہیں پہنچتا۔ اور نہ صرف صداقت کا اقرار کر لینے سے دنیا میں ایسی روح پیدا ہو سکتی ہے۔ جو کسی تغیر کا موجب ہو سکے۔ بہت لوگ ہیں جو عیسائیت کو سچا مانتے ہیں۔ مگر باوجود ان کے عیسائیت کو سچا ماننے کے۔ ہندوؤں کے ہندو مذہب کو سچا ماننے کے مسلمانوں کے اسلام کو سچا ماننے کے ان کی زندگیاں بچپن سے موت تک کوئی ایسی حرکت نہیں پیدا کر سکتیں جسے دائمی حرکت کہا جا سکے۔ کروڑں بچے ہندوؤں' عیسائیوں اور مسلمانوں کے ہاں پیدا ہوتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ ان کے پیدا ہونے سے نام کے طور پر عیسائیوں' ہندوؤں یا مسلمانوں کو کوئی فائدہ ہو تو ہو۔ مگر ان کی وجہ سے جس مذہب میں وہ پیدا ہوتے ہیں اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ وجہ یہ کہ ان کے کسی مذہب کو ماننے کا اقرار اسی حد تک ختم ہو جاتا ہے۔ کہ ہم مانتے ہیں کہ یہ سچائی ہے۔ لیکن اس طرح مان لینے پر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اور نہ یہ جانتے ہیں کہ وہ سچائی جسے

کو مان کر وہ اپنا ایسا طرز عمل قرار دیں کہ جس سے معلوم ہو سکے کہ ان کا مدعا اور مقصد کیا ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں کرتے۔

ان کا ایمان ایسا افرادی رنگ کا ہوتا ہے۔ جیسا چلتے چلتے راستہ میں کسی کو پیاس لگے اور وہ پانی پی لے۔ اس کے پانی پینے سے اس مقصد اور مدعا پر جس کے لئے وہ گھر سے نکلا ہو۔ کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یا اس طرح کہ سفر پر جاتے ہوئے رستہ میں کوئی پھل فروخت ہو رہا ہو اسے خرید لے۔ اس کا اثر اس کے رستہ چلنے اور گھر سے نکلنے پر نہیں پڑے گا۔ کیونکہ جو شخص کوئی مقصد قرار دے کر گھر سے نکلتا ہے۔ اس کی ساری کوشش اسی کے لئے ہوتی ہے۔ ایسے شخص کو اگر راستہ چلتے کوئی ایسی چیز بھی مل جائے جس کی اسے ضرورت ہو اور جسے وہ خریدنا چاہے۔ تو بھی اصل مقصد اور مدعا کے حاصل کرنے میں دیر ہو جانے کی وجہ سے وہ کہتا ہے۔ چلو آتے وقت خرید لیں گے۔ غرض رستہ چلنے والا راستہ میں جو عمل کرتا ہے۔ کسی سے بات کرتا ہے۔ کسی سے ملتا ہے۔ کوئی قدم اٹھاتا ہے۔ ہر وقت اس کے سامنے وہی بات رہتی ہے جس کے لئے وہ گھر سے نکلتا ہے۔ اور وہ اس کا مقصد اور مدعا ہو جاتی ہے۔ اور جو انفرادی اعمال ہوتے ہیں ان کا اس پر اثر نہیں پڑتا۔

جو لوگ اپنا کوئی مقصد قرار دے لیتے ہیں۔ ان کی اور حیثیت ہوتی ہے۔ اور جو نہیں قرار دیتے ان کی اور۔ اسلام میں پیدا ہو کر اس کو سچا ماننے والے۔ عیسائیت میں پیدا ہو کر عیسائیت کو سچا ماننے والے۔ ہندوؤں میں پیدا ہو کر ہندو مذہب کو سچا ماننے والے جو اپنے اپنے مذہب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے۔ وہ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ جو اپنا مقصد اور مدعا مذہب کو قرار نہیں دیتے۔ اور جو لوگ مقصد قرار دے لیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ انہیں اپنے مذہب کے ذریعہ دنیا میں صداقت قائم کرنی ہے۔ وہ ساری زندگی اس میں لگا دیتے ہیں۔ اور ہر کام جو وہ کرتے ہیں۔ اس میں ان کے مدنظر یہی بات ہوتی ہے۔

اب دیکھو ایک احمدی ہے یعنی ایسا شخص جس کے سامنے دلائل پیش کئے گئے اس نے سمجھے اور مان لئے۔ اور وہ احمدی بن گیا۔ اب اگر اس کے احمدیت کے اقرار کو زبان سے ہٹا دیا جائے اس کے یقین کو دل سے نکال دیا جائے۔ اور صداقت کے خیال کو دماغ سے علیحدہ کر دیا جائے۔ تو وہ ویسے کا ویسا ہی رہ جائے گا جیسا کہ پہلے تھا۔ کیونکہ احمدیت کا اس پر کوئی اثر نہ تھا۔ اور اس نے احمدیت کو اپنا مقصد اور مدعا قرار نہ دیا۔

لیکن جو مذہب کو اپنا مدعا اور مقصد قرار دے لیتا ہے۔ وہ صداقت کو قبول کرنے پر ہی بس نہیں

یہ کہ اس کا اثر انفرادی طور پر کیا پڑے گا اور عام طور پر کیا۔ پھر یہ کہ آیا ممکن ہے کہ میں اس سچائی کو اختیار کروں اور مجھ پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوتی ہو۔ یا یہ کہ میرا ماننا اور نہ ماننا برابر ہے یا اس میں کچھ فرق ہے۔ میری نہ ماننے کی حالت اور ماننے کی حالت یکساں ہونی چاہیئے۔ یا اس میں کوئی فرق ہونا چاہیئے۔ یہ ایک سلسلہ سوالات شروع ہو جائے گا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ سمجھ لے گا کہ اس پر دو قسم کے فرض عائد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ چونکہ وہ سب سے ضروری چیز ہے۔ جو اس نے اختیار کی ہے۔ اور دنیا میں جو کام بھی وہ کرتا ہے۔ علم پڑھتا ہے۔ ملازمت کرتا ہے۔ یا کوئی اور کام کرتا ہے۔ اس سے جو فائدے پہنچ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ اس سے پہنچتے ہیں۔ اور اسے ترک کرنے سے باقی تمام چیزوں کے ترک کرنے سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اور اس پر اس کی ساری زندگی کا مدار ہے۔ یہی اس کا مقصد اور مدعا ہے۔ اس صورت میں جو بھی کام وہ کرے گا۔ اس میں دیکھ لے گا کہ اس سے اس کے مذہب اور اس کی قبول کردہ صداقت پر تو کوئی الٹا اثر نہیں پڑتا۔ میرے تعلقات اور معاملات تو اس جڑ کو صدمہ نہیں پہنچاتے جس کو میں نے ساری چیزوں سے مقدم رکھا ہے۔ جب وہ اس بات کو سوچے گا۔ اور اس کے نزدیک احمدیت تمام چیزوں سے پیاری چیز ہوگی۔ تو وہ ہر بات کے متعلق بآسانی فیصلہ کر سکے گا۔ کہ اس میں وہ شامل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر اس میں شامل ہونے یا اسے اختیار کرنے سے احمدیت پر برا اثر پڑے گا تو وہ اختیار نہیں کرے گا۔ اور اگر اس سے احمدیت کو فائدہ پہنچے گا تو اختیار کر لے گا۔

اور جب اس کی یہ حالت ہوگی تو وہ سمجھے گا۔ کہ میں دنیا سے علیحدہ کوئی وجود نہیں ہوں۔ بلکہ ہر انسان کا اثر مجھ پر پڑ رہا ہے۔ اور ہر تغیر کا مجھ پر اثر ہو رہا ہے۔ جس طرح چاند، سورج، ستاروں کا اثر اس تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح انسانوں کا اثر بھی پہنچتا ہے۔ اور ممکن نہیں کہ کوئی کہدے کہ امریکہ یا یورپ یا چین یا جاپان کا یہ خیال ہے مجھے اس سے کیا تعلق؟ کیونکہ کوئی عقیدہ اور کوئی خیال ایسا نہیں جو پیدا ہوا ہو اور پھر اپنی جگہ پر ہی رہا ہو۔ اس کا اثر ساری دنیا میں پھیل جاتا ہے۔ اور اگر ایسی بات عقل صریح کا مقابلہ نہیں کرتی تو خواہ جھوٹی بھی ہو تو دنیا میں اثر کرتی ہے۔ دیکھو یورپ میں جو حالات پیدا ہوئے ان سے ہندوستانیوں کو کیا تعلق مگر اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنے ملک میں کوئی دانا نظر ہی نہیں آتا۔ سیاسی باتوں کو جانے دو۔ کیونکہ یہ محدود حلقہ کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ اور اپنے فوائد کی وجہ سے اختیار کی جاتی ہیں۔ ایک ہندوستان کا رہنے والا اپنے فوائد کی وجہ سے مسٹر گاندھی کے پیچھے چلے تو چلے۔ علمی رنگ میں اور دانائی و عقلمندی کی خاطر پیچھے نہیں چلے [illegible]

آدمی ہیں۔ لیکن چونکہ وہ اپنے فوائد مسٹر گاندھی کے پیچھے چلنے میں نہیں سمجھتے۔ اس لئے نہیں چلتے۔ تو سیاسی خیالات ایک محدود طبقہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ مگر علمی باتوں کا اثر بہت وسیع ہوتا ہے۔ وہ جرمنوں سے تعلق نہیں رکھتیں۔ مگروہ ان کے پیچھے چلتے ہیں۔ ان کا تعلق فرانسیسیوں سے نہیں ہوتا۔ مگروہ ان کی پیروی کرتے ہیں۔ اسی طرح اور لوگ ان کو تسلیم کرتے اور ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہی لالہ لاجپت رائے جو آریہ سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ یورپ کے عقل مند ویدوں کے رشیوں منیوں سے کم نہ تھے۔ اتنی عداوت کے باوجود جو یورپ کے لوگوں کے متعلق یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں۔ لالہ لاجپت رائے یہ کہنے پر مجبور ہی ہو گئے۔ اور ان کی فضیلت کا اقرار انہیں کرنا ہی پڑا۔ وجہ یہ کہ یہ علمی بات ہے جو وسیع سوال ہے۔ اور ایسا سوال آدمیت سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ ملکوں سے۔ اور سارے انسانی دماغوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پس یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ یورپ کا خیال ہے۔ یا جاپان کا خیال ہے۔ یا امریکہ کا خیال ہے۔ اس سے ہمیں کیا غرض۔ میں نے صداقت کو قبول کر لیا ہے۔ اور اتنا ہی میرے لئے کافی ہے۔ کیونکہ وہ خیال اگر ایسے لوگوں میں پیدا ہوا ہے۔ جن میں جوش ہے اور وہ عقلی بات ہے تو بہت سے لوگ اس کے اثر میں آجائیں گے اور انہیں دھوکہ لگ جائے گا۔

اور آج جو نور ہم نے اپنے گھروں میں داخل کیا ہے۔ بعد میں آنے والے ممکن نہیں بلکہ اغلب ہے کہ اسے اپنے گھروں سے نکال دیں۔ کیونکہ جب کسی بدی کو مٹایا نہیں جاتا۔ تو وہ پھیلتی ہے۔ مثلاً بیماریاں ہی ہیں جب تک ان کا مقابلہ نہیں کیا جاتا پھیلتی جاتی ہیں یا جب تک خدا ہی ان کی تباہی کے اسباب نہ کرے بڑھتی جاتی ہیں۔ یہ نیچر کا قانون ہے۔ کہ ایک وقت تک ایک چیز اپنا جوش دکھا کر ٹھنڈی پڑنے لگ جاتی ہے۔ طاعون کے متعلق ہی دیکھ لو۔ انگریزوں نے تو بڑی بڑی کوششوں کے بعد یہی نکالا کہ جس کو طاعون ہو جائے وہ یہ علاج کرے۔ یا اس کے لئے یہ احتیاط کی جائے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے اس کو ٹھنڈا کر دیا کہ اب پہلے کی طرح اس کے حملے نہ ہوں۔

تو وسیع اثر کرنے والی باتیں اور چیزیں اس طرح بھی دب جاتی ہیں۔ لیکن ایک اگر دب جائے تو دوسری نکل آتی ہے۔ دوسری کے ٹھنڈے پڑنے پر تیسری۔ اور جب تک صداقت کو نہ پھیلا دیا جائے یہ خطرہ لگا ہی رہتا ہے۔

پس جب انسان یہ سمجھ لے کہ وہ دنیا میں اکیلا نہیں بلکہ اور لوگ بھی ہیں۔ اور جب یہ سمجھ لے کہ اگر وہ آبادی سے الگ تھلگ کسی جنگل اور قلعہ میں بھی ہو تو بھی دوسروں کے خیالات کے اثر سے بچ نہیں سکتا۔ اور اگر وہ متاثر نہ ہو تو اس کی اولاد یا اولاد کی اولاد متاثر ہو جائے گی۔ پھر جب وہ یہ بھی سمجھے گا کہ جو صداقت اس نے قبول کی ہے راحت و آرام حاصل کرنے کا وہی ذریعہ

ہے۔ تب وہ اس بات کو اپنا مقصد اور مدعا قرار دے لے گا۔ کہ جب تک دوسرے خیالات مٹا کر وہی خیالات جو میں نے قبول کئے ہیں نہ پھیلاؤں۔ صبر نہ کروں گا۔ ایک ایسے انسان کی زندگی میں اور اس انسان کی زندگی میں جس کو اس بات کا احساس نہیں ہوگا بہت بڑا فرق ہوگا۔ وہ جس نے احمدیت کو قبول کیا اور اس نے سمجھا کہ یہ بہترین سے بہترین چیز ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے مقابلہ میں کچھ بھی آجائے۔ اس کی وہ کوئی پروا نہیں کرے گا وہ اس کے لئے قطعاً" مفید اور فائدہ بخش نہیں ہوگی۔

اور اس کے ساتھ ہی جب وہ یہ سمجھے گا کہ اور لوگوں کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں۔ کہ جب تک اسے روکا نہ جائے بڑھتی ہے۔ جب ان باتوں پر غور کرے گا تو اس کی زندگی ایک عام زمیندار کی زندگی کی طرح نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کی زندگی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سی زندگی ہوگی اور حقیقت میں وہ زندہ ہوگا۔ ایک زمیندار اور ایک تاجر بھی زندہ ہوتا ہے۔ مگر وہ ایسے ہی زندہ ہوتے ہیں جیسے ۔ بھیڑ بکری۔ جیسے وہ کھانا کھاتی اور پانی پیتی ہے۔ اسی طرح یہ کھانا کھاتے اور پانی پیتے ہیں۔ جس طرح وہ گھاس تلاش کرتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی اپنی خوراک تلاش کرتے ہیں۔ یہ کوئی روحانی زندگی نہیں ہوتی۔ روحانی زندگی ایک الگ زندگی ہوتی ہے۔ اس میں یہی نہیں ہوتا کہ انسان کھاتا پیتا پہنتا ہے۔ بلکہ ان سے بالا چیز حاصل کرتا ہے۔ اور پھر اس سے بالا ہوتا ہے۔ کہ دوسروں تک اس چیز کو پہنچاتا ہے۔ اور ایسے ہی لوگ واقع میں زندہ ہوتے ہیں۔ جن کے آگے دوسرے مردوں کی طرح جا پڑتے ہیں۔

اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ایسی ہی زندگی حاصل نہ تھی۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ابوبکرؓ، عمرؓ کو جس طرح کہتے اسی طرح وہ کرتے۔ کیا ان میں ظاہری زندگی نہ تھی۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سوا کوئی تھا جو عمرؓ کی گردن اپنے آگے جھکا سکتا؟ مگر آپ اگر ان کو موت میں بھی ڈالتے تو جاتے اور ذرا حیل و حجت نہ کرتے۔ ان کی مثال ایسی ہی تھی۔ جیسے تنور والے کے ہاتھ میں لکڑیاں ہوتی ہے۔ جو انہیں تنور میں ڈالتا جاتا ہے۔ اور وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ وہ مردہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح ابوبکرؓ، عمرؓ جو کھینچی ہوئی تلوار تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں جا کر لکڑیاں بن گئے تھے۔ اور وہ مردہ تھے۔ اور مردہ چیز زندہ کے ہاتھ میں بولا نہیں کرتی زندہ جس طرح چاہتا ہے اس کے ساتھ کرتا ہے۔

پس یہ روحانی زندگی ہوتی ہے۔ جو دنیا میں تغیر پیدا کرتی ہے۔ اور یہ انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ جو اپنی زندگی کا مقصد اور مدعا مذہب کو قرار دے لیتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں وہ لوگ جن کا عدم وجود برابر ہوتا ہے۔ وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو اس بات کو اپنا مقصد نہیں بناتے وہ کھانے پینے

کو اپنا مقصد اور مدعا سمجھتے ہیں۔ اور دین کو ایک ضمنی بات۔ مثلاً ایک زمیندار ہے۔ وہ اپنا کام یہی سمجھے گا۔ کہ کھاؤں پیوں۔ ہاں ساتھ کوئی مذہب بھی اختیار کر لوں۔ اس کا مذہب اختیار کرنا ایسا ہی ہو گا۔ جیسے کچہری جاتے ہوئے کسی جگہ سے پانی پی لیتا ہے۔ یا کوئی میوہ کھا لیتا ہے۔ کوئی اس حالت میں اسے دیکھے۔ اور کہے یہ کچہری نہیں جارہا بلکہ یہی کام کرنے آیا ہے۔ تو اس کی غلطی ہوگی۔ اور اس کا پتہ بھی لگ جاتا ہے۔ جبکہ پانی پینے میں اسے دیر لگ جائے۔ اور کچہری سے آواز آئے کہ فتح محمد ہے۔ تو وہ پانی چھوڑ دے گا۔ اور یہ درمیانی چیز قربان کر کے ادھر بھاگ پڑے گا۔ تو بالعموم ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ جن کا مقصد اور مدعا دنیاوی چیزیں ہوتی ہیں۔ اور مذہب کو وہ اسی طرح ایک درمیانی اور ضمنی چیز سمجھتے ہیں۔ جس طرح کوئی کچہری جاتے ہوئے پانی پی لیتا ہے۔ میوہ کھا لیتا ہے۔ یا کوئی چیز خرید لیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا۔ کہ اس کا اصل کام یہی تھا۔ بلکہ یہ کہ اسے کچہری کے کام سے فرصت مل گئی تو اس نے اس کام کو کر لیا۔ ان لوگوں کا مذہب کے متعلق یہی حال ہوتا ہے۔ کہ زمینداری سے یا اور دنیاوی کام سے فرصت مل گئی تو ظہر و عصر کی نماز پڑھ لی۔ یا نماز پڑھنے سے ان کے کام میں کوئی ہرج نہ ہوا تو پڑھ لی۔ لیکن اگر کوئی کام ہو۔ اور اس کو چھوڑنا پڑے تو پھر نہیں پڑھیں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصد زمینداری یا اور کوئی دنیاوی کام ہے۔ کیونکہ اس پر وہ دین کے کام کو قربان کر دیتا ہے۔ ورنہ اگر وہ اپنا مقصد مذہب کو قرار دیتا۔ تو اس کے الٹ کرتا۔ جب وہ اپنا مقصد مذہب کو سمجھ لے گا۔ تو پھر ایسا ہو گا۔ کہ جس طرح کچہری کی طرف سے آواز آنے پر مٹھائی خریدنا چھوڑ کر ادھر بھاگ پڑتا ہے۔ اسی طرح جب دین کی طرف سے آواز آئے۔ تو سب کچھ چھوڑ کر ادھر متوجہ ہو جائے گا۔

اور پھر یہ نہیں ہو گا کہ وہ مذہب کو اپنا مقصد بنائے نماز پڑھے۔ روزے رکھے۔ حج کرے۔ زکوٰۃ دے۔ مگر پھر بھی اس کی بیوی اور رشتہ داروں کو پتہ نہ ہو۔ کہ اس کا کیا مذہب ہے۔ بلکہ وہ زندہ کی طرح ہو گا۔ اور کہے گا۔ کہ مجھے خطرہ ہے کہ اگر میں نے اپنی بیوی۔ اپنے رشتہ داروں اور اپنے قریب رہنے والوں کو دین نہ سکھایا تو میری اولاد پر ڈاکہ ڈالیں گے اور اس کو تباہ کر دیں گے۔ اس صورت میں اس کی اور زندگی ہوگی۔ یہ زندہ نظر آئے گا۔ اور دوسرے اس کے سامنے زندہ مردہ ہونگے اور جس طرح وہ چاہے گا۔ ان کو سکھائے گا۔

یہ بات ہے جس کی طرف میں نے پہلے بھی آپ لوگوں کو توجہ دلائی ہے۔ اور اب بھی دلاتا ہوں کہ اپنی زندگیوں کو زندہ بناؤ۔ اور مذہب قبول کر کے دیکھو کہ اسے تم نے اپنا مقصد بنا لیا ہے یا دنیا کی اور چیزیں تمہارا مقصد ہے۔ اگر مذہب ہے تو دیکھو تم نے اس کے لئے کیا کیا قربانیاں کی ہیں؟

اگر تم اس بات کو سمجھ لو۔ تو تمہاری موجودہ زندگی خواہ تم کسی پیشہ میں ہو۔ ایک لفظ بھی نہ پڑھے ہوئے ہو۔ لوہار اور ترکھان کا کام کرتے ہو۔ تو بھی ایسی تبدیلی کر سکو گے کہ دنیا حیران رہ جائے گی۔ اور میں جانتا ہوں۔ کہ جب کوئی قوم کسی کام کو اپنا مقصد قرار دے لے۔ تو اسے کرکے ہی چھوڑتی ہے۔

سکھوں کی قوم کو ہی دیکھ لو یہ ایک جاہل قوم تھی۔ اس نے جب اپنا ایک مقصد قرار دے لیا۔ تو باوجودیکہ ان پر بڑے بڑے ظلم ہوئے۔ جیسے کہ پھر انہوں نے کئے۔ ان کے گوروؤں کے لڑکے زندہ چن دئے مگر آخر کامیاب ہوگئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان سے غلطی ہوگئی۔ اور بجائے اس کے کہ وہ مذہب کو اپنا مقصد قرار دیتے۔ اور دنیا کو اس کے لئے حاصل کرتے۔ انہوں نے یہ کیا کہ سمجھ لیا کہ مذہب کی تب حفاظت ہو سکتی ہے کہ دنیا پر حکومت ہو۔ مگر پھر وہ مذہب کو بھول گئے۔ اور حکومت ہی حکومت ان کے مدنظر رہ گئی۔ تو یہ زمیندار یا پیشہ ور لوگ تھے لوہار، ترکھان' جو حکومت کے لئے کھڑے ہوگئے۔ ادھر مغلوں کی حکومت تھی۔ اور ادھر انگریز۔ مگر یہ حاکم بن گئے۔ رنجیت سنگھ ایک معمولی زمیندار تھا۔ لیکن آخر بادشاہ بن گیا۔ وجہ یہ کہ انہوں نے اپنا جو مقصد قرار دے لیا تھا اس کے لئے ہر چیز کو قربان کر دیا۔ حتیٰ کہ اصل چیز کو بھی بھول گئے۔ اگر وہ اپنا مقصد یہ رکھتے کہ مذہبی آزادی حاصل کرنی ہے۔ تو ایسا نہ ہوتا۔ جیسا کہ اسلام نے کیا۔ اسلام کے مقابلہ میں حکومتیں آئیں کہ اسے پھیلنے نہ دیں گے۔ انہیں مسلمانوں کو مٹانا پڑا۔ مگر اصل مقصد انہوں نے اپنا مذہب رکھا نہ کہ حکومت کرنا اس لئے وہ مذہب پر قائم رہے۔

پس جس قوم کے مدنظر اپنا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اس میں اور دوسری میں ایسا ہی فرق ہوتا ہے۔ جیسا مردہ اور زندہ میں۔ یہ بات میں پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں کہ جب تک تم میں یہ روح نہ ہوگی۔ تم ترقی نہ کر سکو گے۔ مذہب کو صرف قبول کر لینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ آئندہ زندگی کے لئے بطور مقصد اور مدعا سمجھنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ کیا ہم یہ نہیں مانتے کہ فلاں فلاں پہاڑ ہے۔ یا بٹالہ ایک شہر ہے۔ مگر اس سے ہم پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہمارا کیا حرج ہوتا۔ ہاں ہمیں یہ پتہ نہ ہو کہ بٹالہ ایک شہر ہے اور وہاں فلاں چیز ملتی ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ تو حرج ہوگا۔ اور جب اس کا پتہ لگے گا۔ تو ہم اس طرف جائیں گے۔ اور یہ ہمارا مقصد ہو جائے گا۔ پس مذہب کو صرف مان لینا ہی کافی نہیں اس کو اپنا مقصد قرار دو۔ تب تمہیں وہ بات حاصل ہوگی۔ جس کے حاصل کرنے کی تمہارے دل میں تڑپ ہے۔ مگر تم صحیح ذرائع پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے اسے حاصل نہیں کر سکتے۔

(الفضل ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۱ء)